علم البلاغت

قافیہ:- قافیہ وہ ہم آہنگ الفاظ ہوتے ہیں جو ردیف سے پہلے (آواز کے معمولی فرق کے ساتھ) آتے ہیں۔ مثلاً خبر، نظر، ڈگر اور اثر وغیرہ۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر غزل میں ردیف ہو ہی۔ ردیف نہ ہونے کی صورت میں اشعار قافیہ پر ختم ہو جاتے ہیں۔

ردیف:- ردیف وہ لفظ یا الفاظ ہوتے ہیں جو مطلع کے دونوں مصروں کے آخر میں اور پھر غزل کے ہر شعر کے مصرع ثانی کے آخر میں دہرائے جاتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کے غزل میں 'ہونے تک' ردیف ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک۔

کون جیتا ہے تیرے زلف کے سر ہونے تک۔

تجاہلِ عارفانہ:- کسی ذاتی خصوصیات سے چشم پوشی کرنا یا کسی بات کو جان کر کسی وجہ سے انجان بننا تجاہلِ عارفانہ کہلاتا ہے۔ غالبؔ کا ایک شعر ہے جس میں انھوں نے تجاہلِ عارفانہ سے خوب خوب کام لیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

ادماج:- جب کسی کلام میں ایک سے زیادہ معنی مقصود ہو یعنی کوئی شعر معنی مقصد کے علاوہ کوئی اور معنی بھی اپنے آپ میں رکھتا ہو تو اسے ہم ادماج کہتے ہیں۔ ادماج سے مراد وہ کلام ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ معنی نکلتا ہو۔ شمس منیریؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

آخر وقت تو جہ ادھر بھی ہو ساقی۔

کہ تیرے مست کا لبریز جام ہو جائے۔

مجازِ مرسل:- جب کسی لفظ کو اس کے مجازی معنوں میں استعمال کیا گیا ہو اور علاقہ سبب مسبب کا ہو تو اسے ہم مجازِ مرسل کہتے ہیں۔ جیسے 'کلاس کھالی ہے اور شعبے کی کرسیاں اونگھ رہی ہے'۔ یہاں کرسیاں استعارہ ہے اور یہ اشارہ کرتی ہے کہ اساتذہ اونگھ رہے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ۔

دریا سے اٹھتی ہے ساحل سے نہ ٹکرائی۔

اس شعر میں بھنور کی آنکھ نہیں روتی ہے بلکہ دراصل آدمی رو رہا ہے۔ یہاں روتی ہے بھنور کی آنکھ مجازِ مرسل ہے۔

مبالغہ:۔ مبالغہ کسی کلام میں بولا گیا وہ جھوٹ ہے جو اس طرح بولا گیا ہو کہ وہ بالکل سچ معلوم ہو۔ شعر ملاحظہ ہو۔

بے سبب زلزلہ عالم میں نہیں آتا ہے۔
کوئی بے تاب تہہِ خاک تڑپتا ہوگا۔

صنعت تکرار:۔ جب کسی کلام میں ایک ہی لفظ کو دو یا دو سے زیادہ مرتبہ استعمال کر کے کلام کے معنوی حسن کو بڑھا دیا جائے تو اس شعری اصطلاح کو صنعتِ تکرار یا صنعتِ تکرار لفظی کہتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

روتے روتے کون سویا خاک پر۔
ہلتے ہلتے کس کا جھولا رہ گیا۔

تشبیہ:۔ دو مختلف چیزوں میں قدرِ مشترک کی تلاش اور اس کے اظہار کا نام تشبیہ ہے۔ تشبیہ میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ مشبہہ، مشبہ بہہ اور وجہ شبہہ۔ جس چیز کو تشبیہ دی جا رہی ہو اسے مشبہہ کہتے ہیں۔ جس چیز سے تشبیہ دی جا رہی ہو اسے مشبہ بہہ کہتے ہیں۔ اور وہ صنعت جو دونوں مے درمیان قدرِ مشترک ہے یعنی جس چیز میں دونوں شریک ہیں اسے وجہ شبہہ کہتے ہیں۔ اگر کسی شعر میں یہ تینوں چیزیں موجود ہوں تو اسے ہم تشبیہہ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ برقی قمقمے یوجگمگا رہے تھے جیسے آسمان میں ستارے، تو یہ تشبیہہ ہوا۔ کیونکہ اس میں تینوں چیزیں موجود ہے۔ مثال کے طور پر میرؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

نازکی اس کی لب کی کیا کہیئے۔
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔

میرؔ نے یہاں معشوق کی لب کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہہ دیا ہے۔ اس شعر میں میرؔ کی معشوقہ کا لب مشبہہ ہوا۔ گلاب کی پنکھڑی مشبہہ بہہ اور دونوں میں نازکی اور ہلکی سُرخی پائی جاتی ہے اس لئے یہ وجہ شبہہ ہوا۔ مذکورہ بالا شعر تشبیہہ کا لافانی نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

غلو:۔ جس کلام میں کوئی بات عقل و عادت دونوں کے خلاف ہو تو اسے ہم غلو کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر شعر ملاحظہ ہو۔

کاٹا پلک میں آنکھ کو پُتلی میں نور کو۔
پاؤں میں کجروئی سروں میں غرور کو۔

تلمیح:- کلام میں خوبیاں پیدا کرنے اور اسے موثر بنانے کے لئے جو تدابیر استعمال کی جاتی ہے انھیں صنعت کہا جاتا ہے۔ان میں سے تلمیح بھی ایک اہم صنعت ہے۔تلمیح شعر کو نہ صرف موثر بناتی ہے بلکہ شعر کے معنی میں گہرائی و گیرائی بھی پیدا کرتی ہے۔تلمیح سے جو ایک اور فائدہ شاعر کو ہوتا ہے وہ اختصر ہے اور شاعری کے لئے اختصار ایک ضروری چیز ہے۔شاعر کو وضاحت وصراحت کے بجائے ڈھکے چھپے انداز میں اپنی بات پیش کرنی ہوتی ہے۔کبھی کبھی وہ اساروں سے بھی اپنی دلی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔اس لئے وہ کم سے کم لفظوں کا استعمال کرتا ہے۔تلمیح کے سہارے شاعر بڑے سے بڑے بات یا بڑے سے بڑے تجربے کو بھی آسانی سے مختصر لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کشتی مسکیں و جان پاک و دیوارِ یتیم۔

علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش۔

اس شعر کو سمجھنے کے لئے حضرتِ موسیٰ اور خضر کا پورا واقعہ جاننا ضروری ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ کشتی مسکیں و جان پاک و دیوارِ یتیم کے بارے میں تفصیل معلوم ہو۔شاعر ان تمام تفصیلات کو چھوڑ کر صرف اشارہ کر دیتا ہے اور یوں چند لفظوں سے کام لے کر شاعر ماضی کے واقعات کو بیان کر دیتا ہے۔

تلمیح کا لغوی معنی ہے کسی چیز کی طرف اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنا۔ادب کی اصطلاح میں تلمیح اس صنعت کا نام ہے جس سے نظم یا نثر میں اسارے کے طور پر کسی افسانے قصے یا واقعہ کا مختصراً اس طرح ذکر کیا جائے کہ بغیر اس کی تفصیل جانے کلام کا سمجھنا مشکل ہو۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ الفاظ یا تراکیب جس سے کسی مشہور واقعے کی طرف اسارہ کیا گیا ہو جس کو جانے بغیر کلام کا سمجھنا دشوار ہو تلمیح ہے۔ضروری یہ ہے کہ کلام میں جو اسارہ کیا گیا ہو اس سے مراد پورا واقعہ ہی ہو۔شاعر اپنے مقصد کے مطابق پورے واقعہ کے کسی ایک پہلو یا جز کو پیشِ نظر رکھ کر تلمیح کا استعمال کرتا ہے۔مثال کے طور پر شعر میں اس بات کی طرف اسارہ ہے کہ حضرت موسیٰ پیغمبر ہونے کے باوجود خضر جیسا علم نہیں رکھتے تھے اور اس بات کی تائید کشتی مسکیں وغیرہ جیسے واقعات سے ہوئی ہے۔تلمیح سے محض کسی وقعے کا بیان مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کے سہارے شاعر اپنے وسیع خیال کو چند لفظوں میں بیان کر دیتا ہے اور اپنے تجربہ کو زیادہ سے زیادہ شدید اور موثر بنا کر پیش کرتا ہے۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

خدا اگر عشق کو پیدا نہ کرتا۔

تو بندہ حسن پر کاہے کو مرتا۔

استعارہ:-عبدل مجید دریابادیؔ کا خیال ہے کہ جب مجازی اور حقیقی معنوں کے بیچ تشبیہہ کا علاقہ ہوتو ایسے مجاز کو ہم استعارہ کہتے ہیں۔مطلب یہ کہ جس شعر میں مشبہہ بہہ کو ہم مشبہہ قرار دیتے ہیں یعنی جس شعر میں صرف مشبہہ ہو اور مشبہہ بہہ کا استعمال نہ وہا ہوتو ایسے مجاز کو ہم استعارہ کہتے ہیں۔جیسے مدتوں بعد آپ کے گھر کوئی آئے اور آپ کہیں کہ یہ 'عید کا چاند' کہاں سے نکلا تو یہ استعارہ ہوا۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اس دور میں زندگ بسر کی ہے۔ بیمار کی رات ہوگئی۔

یہ سنتے ہی تھرّ اگیا گلہ سارا۔ یہ راعی نے للکار کر جب پکارا۔

اس شعر کے اندر بیمار کی رات استعارہ ہے۔اب ذرا اس کے پیکر پر غور کریں تو یہ استعارہ پریشان وقرب انگیز اور بہت سی کیفیتوں سے بھری ہوئی زندگی کا بھی استعارہ ہے۔

حُسنِ طلب:-جب کسی شعر میں دل پسند انداز میں کسی چیز کا طلب کیا گیا ہوتو اس شعری اصطلاح کو ہم حسنِ طلب کہتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا۔

آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار۔

تضمیں:-کسی بھی شاعر کے کسی مصرع، بند یا کلام پر جب کوئی دوسرا شاعر ایک نئے قسم کی بات یا خیالات کو اپنے کلام میں پیش کرے تو اس شعری اصطلاح کو تضمین کہا جاتا ہے۔شعر ملاحظہ ہو۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو۔ ابھی اٹھ کر وہ پھر رونے لگے گا۔

ابہام:-جب کسی کلام میں ایک مصرعے کا لگاؤ دوسرے سے کٹا ہوا ہو۔ایک مصرعے میں شاعر کچھ کہے اور دوسرے میں کچھ اور۔ساتھ ہی ساتھ جس کے درمیان کچھ خلاء پیدا ہو جاتا ہے تو ہم اسی خلاء کو فنی ابہام کہتے ہیں۔جسے سمجھ لینا ہی شعر کو سمجھ لینا ہے۔شعر ملاحظہ ہو۔

کس کو معلوم کہ ہم حسن شناسانِ اجل۔

کتنے اوہام سے گزرے تو یقیں تک پہونچے۔

اس شعر میں شاعر کتنے اوہام بول کر شعر کے اندر بہت بڑا خلاء پیدا کر دیتا ہے۔کتنے اوہام نہ بول کر اگر شاعر کتنے راستوں بولتا تو یہ خلاء نہیں ہوتا۔شاعر وہم، اوہام، پرچھائی، شک اور گمان وغیرہ جیسے منازل سے گزر کر یقین تک پہونچتا ہے۔یہاں پر وہم فنی ابہام ہے۔

تجنیسِ تام:- دولفظوں کا صورت میں مشابہ ہونا اور معنی میں مختلف ہونا تجنیس کہلاتا ہے۔جس کسی کلام میں دو لفظوں کا انوا، اعداد اور ترتیب حروف اور حرکات وسکنات میں متفق ہوں اور ساتھ ہی ساتھ معنی میں بالکل مختلف ہوں تو اسے ہم تجنس تام کہتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

طلائی وہ بندہ پڑا کان میں۔

زرِخالص ایسا کہاں کان میں۔شاباںؔ

مرعات النظر یا تناسب:-کسی کلام میں کسی مثل کو پیش کر دینے کا نام مرعات النظیر یا تناسب ہے۔اس کے علاوہ اس کلام میں چند ایسی چیزوں کا بھی ذکر ایک جگہ کرنا جس میں جس طرح کا تضاد ہو اسی طرح کی مناسبت بھی ہو۔ شعر ملاحظہ ہو۔

خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے۔

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے۔

صنعت اشتقاق:- جملوں میں یا بیت میں چند ایسے الفاظ کا ذکر کرنا جو ایک ہی مصدر یا مادہ سے مشتق ہوں اسے جمع کرنا اس شعری اصطلاح کو صنعتِ اشتقاق کہتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

مجھ کو مت ٹھکراؤ بس چلئے سنبھل کر دیکھ کر۔

چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور دیکھ کر۔

تعجب:-کلام میں کسی انوکھی بات کا ذکر کرنا یا اس کا اظہار کرنا صنعتِ تعجب کہلاتا ہے۔شعر ملاحظہ ہو۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں۔

وہی ذبح بھی کرے ہیں وہی لے ثواب الٹا۔

صنعت عکس:-کلام میں دو جذو کا ذکر کرنا اور پھر جس جذو کو مقدم کیا ہے اس کو موخر اور جس کو موخر کیا ہے اس کو مقدم کرنا اس شعری اصطلاح کو صنعتِ عکس کہتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

گلا کٹوا مزے لے لے کے پھرا ے دل کہاں یہ دن۔

کبھی گردن ہو خنجر پر کبھی خنجر ہو گردن پر۔امیر مینائیؔ

ہم اور غیر دونوں یکجا بہم نہ ہوں گے۔

ہم ہوں گے وہ نہ ہوں گے، وہ ہوں گے ہم نہ ہوں گے۔ذوقؔ

ایہام:-ایہام کا لغوی معنوں ہیں وہم وگمان میں پڑنا۔لیکن فنِ بدیع میں ایہام کا مطلب ہے کلام میں ایسا لفظ لانا جو دو معنی رکھتا ہو۔ایک قریب کا اور دوسرا بعید کا۔ سننے والے کا ذہن قریب معنی کی طرف منتقل ہو لیکن شاعر کو بعید کے معنی منظور ہوں قریب کے نہیں۔اس شعرا صطلاح کو ایہام کہتے ہیں۔شاکر ناجؔی کا شعر ملاحظہ ہو۔

کیوں منڈلاتا ہے زلف کو پیارے۔
دیکھ تجھ کو کہیں گے سب مورکھ۔

اوپر پیش کردہ شعر میں لفظ 'مورکھ' سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔اردو میں 'مورکھ' بے وقوف کو کہتے ہیں۔مگر جب اس لفظ کو دو ٹکڑے میں کر دیا جائے تو اس کا مطلب بال رکھ ہو جائے گا۔غالبؔ کا شعر ملاحظہ ہو۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک۔
کون جیتا ہے تیرے زلف کے سر ہونے تک۔

علامت:-لفظ کی وہ صورتِ حال جس میں لفظ بہت سارے معنی کا مجموعہ بن جاتا ہے تو اسے ہم علامت کہتے ہیں۔علامتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) ذاتی علامت:-فلسفہء حیات اور اس کی ذاتیات کی مخصوص چیزیں ذاتی یا انفرادی چیزوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ادب میں جو علامتیں ہوتی ہیں وہ ذاتی ہوتی ہیں جو تجربوں کی بنا پر بنائی جاتی ہے۔

(۲) آفاقی علامت:-وہ علامت جو دنیا کے سارے لوگوں کے لئے ایک ہو اور اس سے ایک ہی معنی مراد لئے جائیں جو ایک بہت بڑے خطّے یا برّ اعظم کے خیالات وجذبات،تہذیب وتمدن اور ثقافت کی طرف اشارہ کرے۔جیسے سفید رنگ ساری دنیا کے لئے امن اور شانتی کی علامت ہے۔بالکل اسی طرح کراس کا نشان وغیرہ۔

تعلیق:-کسی ایک بات کا دوسرے بات کے ہونے یا نہ ہونے پر موقوف کرنا۔اس شعری اصطلاح کو تعلیق کہتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

اگر سیدھی نگاہِ یار ہو تو تیر ہو جائے۔
ذرا تیر چھی اگر ہوا تو کھینچی شمشیر ہو جائے۔

شاعرانہ تعلّی:-اپنی ذات کی خصوصیات کو کلام میں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا نام شاعرانہ تعلّی ہے۔غالبؔ کا ایک مطلع ہے جس میں انھوں نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے۔شعر ملاحظہ ہو۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے۔کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور۔

صنعت مشاکلت: - جو لفظ کسی کلام میں آ چکا ہے اسی لفظ کو یا اس کے مثل کسی دوسرے لفظ کو کسی دوسرے معنوں میں محض لفظی مناسبت اور لطفِ زبان کے لئے لانا۔ شعر ملاحظہ ہو۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے۔ دیکھئے مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے۔

حُسنِ تعلیل: -کسی امر کی وہ ظاہری اور پسندیدہ علّت بیان کرنا جو حقیقی علّت بیان نہ ہو۔ اس شعری اصطلاح کو حسنِ تعلیل کہتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

بے سبب زلزلہ عالم میں نہیں آتا ہے۔ کوئی بے تاب تہ خاک تڑپتے ہوں گے۔

پیاسی جو تھی سیاہ خدا تین رات کی۔ ساحل سے سر پٹکتی تھی موجیں فرات کی۔ انیسؔ